ادب میں پنجابی ثقافت ۔۔۔ایک مطالعہ

ڈاکٹر رخسانہ بلوچ

Dr. Rukhsana Baloch

Assistant Professor, Department of Urdu,

Govt. College University for Women, Faisalabad.

Abstract:

Punjabi is the prominent language of sub-continent. It is spoken in wide area of Pakistan. It reflects the Punjabi Culture of this specific area. Punjabi Culture is rich in its values, norms, traditions and rituals. The poetry of this language reflects all this. The long tradition of mysticism is also found in this area that is represented in the Sufi poetry like Khana Freed, Bulhy Shah, Baba Freed, Sultan Bahoo, Mian Muhammad Bakhsh and so many other poets. With addition to this Punjabi culture and literature represent values of agrarian spciety. In this article effort is made to analyze the Punjabi culture through its poetry and prose.

ادب ہمیشہ بھید بھرا اور پُراسراریت پر مبنی ہوتا ہے۔اس میں دراصل واشگاف انداز میں خیال پیش نہیں کیا جاتا بلکہ تخلیق کار رمز وایمائیت کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ایسی ہر چیز جو رمز وایمائیت پر مبنی ہوتی ہے۔اس کو عموماً مافوق الفطرت قوتوں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔تخلیقیت کا مبدا نا معلوم ہے اور اس عمل میں انسان کا ذاتی عمل دخل بھی کم ہوتا ہے۔غالب جیسا شاعر بھی مجبور اُبول اُٹھا:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

یونان میں اس کو دیویوں کی دیوی کی خاص عطا خیال کیا جاتا ہے۔شاعری کا ملکہ اور ادب کی طاقت صرف خاص لوگوں کو خدائی طاقت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔کیا تنقید اس پراسراریت کو گرفت میں لاسکتی ہے؟ کیا یہ عمل مکمل طور پر سمجھا جاسکتا ہے؟ اگر ادب کی تخلیقیت کو گرفت میں لایا جاسکتا ہے تو پھر اس کو پرکھنے کے لیے سائنسی اصول بھی وضع کرنے چاہییں جو ادب میں موجود پرتوں کو کھول سکیں مگر ابھی تک یہ پیرامیٹر ایجاد نہیں ہوئے۔روسی ہیئت پسند ہوں یا نئی تنقید سے تعلق رکھنے والے، کسی

صورت بھی یہ پیمانے بنانے سے قاصر ہیں۔ وکٹر شکلووسکی نے اجنبیانے کے عمل کی مدد سے، رومن جیکب سن نے لسانی شعریات سے، سومتر نے زبان کی ساخت سے، آئی اے رچرڈز نے ادبی مشن میں مخفی مفہوم سے، ولیم ایمپسن نے ابہام سے اور دریدا نے تضادات اور افتراقات سے اس عمل کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر بے سود۔ تا حال یہ عمل ذہنی گرفت سے دور دکھائی دیتا ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ ذہنی عمل کو گرفت میں لانے کے لیے حدود کا ہونا ضروری ہے اور یہ حدود صرف اور صرف مادی چیزوں کی مقرر کی جا سکتی ہیں۔

مذہب جس سے انسان کا قدیم تعلق ہے، جو روحانی اور مادی دونوں معاملات میں ایک راہنما ضابطے کا کام کرتا ہے۔ انسان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ابتدا ہی سے اپنے مشکل حالات پر قابو پانے کے لیے مذہب کی طرف رجوع کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جب کہ مذہب ہر مظہر کی تشریح روحانی انداز میں کرنے کا قائل رہا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات کا ہر واقعہ کسی نہ کسی غیر مادی عنصر کا پیدا کردہ ہے لیکن سائنسی ترقی نے ہر وقوعہ عقلی بنیادوں پر ثبت کر دیا۔ اسی طرح دورِ حاضر کے مفکرین نے کائنات کے مظاہر کو عقلی قوانین کا پابند کر کے اُن تمام واقعات کی تردید کی جو عقلی پیمانوں پر پورے نہ اترتے تھے۔ ہندوستان کی تہذیب ایک عظیم اور وسیع الزاویہ تہذیب ہے اور کئی اعتبار سے عظمت کی مالک بھی ہے۔ قدیم ہندوستان کے تخلیقی دماغوں نے دقتِ نظر اور تخلیقِ فکر کا مظاہرہ کیا وہ علوم کی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ یہ بات آشکار کرتا ہے کہ ادب کا آغاز ہندوستان میں آریوں کی آمد کے بعد سے ہی ہو جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں آریوں کی آمد دو ہزار قبل مسیح میں شروع ہوئی اور یہ سلسلہ وقفے وقفے سے تقریباً پانچ سو قبل مسیح تک جاری رہا۔ آریہ قبائل درہ بولان اور درۂ خیبر کے راستے داخل ہوئے اور مقامی قبائل کو لوٹتے ان کی زمینوں اور مویشیوں پر قبضہ کرتے چلے گئے۔ یہ لُٹے پٹے قبائل جب اقتصادی سطح پر کمزور ہوئے تو غلامی کا طوق ان کے گلے کا مقدر بن گیا۔ آہستہ آہستہ آریاؤں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ جب ان کی آبادی بڑھی تو انھوں نے ایک ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ گنگ وجمن کا رخ کیا اور پورے شمالی ہندوستان پر چھا گئے۔ آریاؤں نے یہاں کے مقامی قبائل دراوڑ اور نیگر کو مفتوح بنا کر نئی طرزِ معاشرت کی بنیاد رکھی۔ دراوڑ ان کی مذہبی رسومات میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ ''رگ وید'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آریا اپنے ہمراہ گیت، بھجن اور مناجاتیں لائے تھے۔ وہ ان گیتوں، بھجنوں اور مناجاتوں کو مقدس اور اپنے اباؤاجداد کی یادگار تصور کرتے تھے۔ ان کا یہ مذہبی اثاثہ سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں زندگی کے معاملات میں تبدیلی رونما ہوئی وہیں ان کے ذہن میں اپنا مذہبی اثاثہ محفوظ بنانے کے خیال نے بھی جنم لیا۔ ایس۔ این داس گپتا اپنی کتاب ''تاریخِ ہندی فلسفہ'' میں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

''یہ ادب ادعائی بیانات وہمی علامتیت اور قربانی کی تفصیل کے بارے میں نہایت بلند پروازِ تخیل کے خیالات پر مشتمل ہے۔قربانی کی رسوم غالباً اس زمانے میں ایسی مکمل حالت میں نہ تھیں جب کہ ابتدائی بھجن تصنیف ہوئے ہیں اور جب بھجنوں کے مجموعے نسلاً بعد نسلاً روایتہً پہنچتے رہے تو رسوم اور بھی زیادہ پیچیدہ ہوگئیں۔پس لازم ہوا کہ مختلف قربانیوں کے فرائض مختلف وغیر پروہت کے طبقوں میں تقسیم کیے جائیں۔۔۔۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک حد درجہ خیالی، مقدس وعلامتی نظام وجود میں آ گیا جس کی نظیر سوائے ناستکوں کے اور کہیں نہیں ملتی۔''(۱)

معروف نفسیات دان ''کارل گستاؤیونگ'' انسانی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے اجتماعی لاشعور کا نظریہ پیش کرتا ہے اور اجتماعی لاشعور کے نظریے میں اساسی نقوش (Archetypes) کو اس کے بنیادی اجزا قرار دیتا ہے۔یونگ کے خیال میں ان سے مل کر ہی اجتماعی لاشعور کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ تجربات جو نسلیں سالہا سال سے مستقل طور پر دہرا رہی ہوتی ہیں ان کا اشاراتی یا مختصر ترین اظہار مع ہیجانات کے یونگ کے نزدیک اساسی نقوش کہلائے گا۔یہ فرد کے کرداری رجحانات کا تعین کرتے ہیں۔ درج بالا نظریات کی روشنی میں پنجابی زبان وادب میں موجود ایسی رسومات سے پردہ کشائی کرنے کی کوشش کی جائے گی جو ہمارے معاشرے میں اس قدر نفوذ کر چکی ہیں کہ ان سے راہِ نجات ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔یہ رسومات کسی ایک فرد، قبیلے قوم اور مذہب کا حصہ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔یہ ہزار ہا سالوں سے برصغیر کی ثقافت کا حصہ رہی ہیں۔''رسم'' کی تعریف کے لیے لغت نویسوں کی جانب رجوع کیا جائے تو درج ذیل معانی دیکھنے کو ملتے ہیں۔''قاموس مترادفات'' کے مصنف وارث سرہندی نے اس کے بارے میں درج کیے ہیں:

''ریت، رواج، چلن، دستور، قاعدہ، طریقہ، طور، انداز، ڈھنگ، روش، طور طریق، پیروی، طرز، آئین، ضابطہ، دستور العمل، اصول وغیرہ۔''(۲)

خواجہ عبدالمجید نے ''جامع اللغات'' میں درج ذیل معنی دیے ہیں:

''دستور، رواج، ریت، طور طریقہ، ڈھنگ، چلن، روش، رویہ وغیرہ۔''(۳)

معاشرہ چاہے جتنا بھی ترقی یافتہ ہو جائے رسومات اور روایات کسی نہ کسی صورت اس میں موجود رہتی ہیں جو کہ ایک حقیقت ہے۔کسی بھی تہذیب کا مطالعہ کیا جائے تو ایسی بہت سی رسومات کے بارے میں معلومات ملتی ہیں جن کا تعلق اس علاقے، معاشرے اور زمین کے ساتھ ان کی جڑت ہوتی ہے۔یہ رسومات انفرادی سطح پر مختلف اقوام، قبائل اور افراد میں دیکھی جا سکتی ہیں جن کا بعض اوقات مذہب سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔یہ تو محض اجتماعی لاشعور کی پیداوار ہی معلوم ہوتی ہیں۔

برصغیر کی تہذیب میں ہندو معاشرہ جو کہ قبل از مسیح سے اس خطے میں اپنی جڑیں پیوست کیے ہوئے ہے ان کے ہاں رائج رسومات برصغیر میں بسنے والے دوسرے مذاہب کے افراد میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں جن سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور لگتا ہے۔ یہ رسومات معاشرے میں موجود افراد کے جسم میں سرائیت کر کے خون سے ہوتی ہوئی ہڈیوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ جدیدیت کی بارہا ویکسینیشن کے باوجود ان کو ختم نہیں کیا جا سکتا البتہ ان کے انداز ضرور بدل جاتے ہیں۔ برصغیر کی تقریباً ۷۰ فی صد آبادی دیہات پر مشتمل ہے اسی وجہ سے ان رسومات اور روایات کی پاسداری ہر ممکن بنائی جاتی ہے۔ دیہی زندگی میں روایات اپنی اصلی حالت میں دیکھی جا سکتی ہیں اور زیادہ تر افراد ان کے بندھن میں بندھے نظر آتے ہیں۔ یہ رسومات غمی اور خوشی کے مواقع پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان رسومات کی ادائیگی کے وقت مختلف قسم کے گیت اور نغمے پیش کیے جاتے ہیں جو اس وقت ناظرین پر ایک سحر طاری کر دیتے ہیں۔ یہ صدیوں سے چلا آ رہا نظام ہے۔ اس میں مذہب کی کوئی قید نہیں۔ شاہد حسین رزاقی کی کتاب ''پاکستانی مسلمانوں کے رسم و رواج'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''رسوم و رواج مخصوص حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ خاص حالات اور ضروریات کے مطابق اس پر عمل کرتے ہیں۔ ہر عمل رفتہ رفتہ اجتماعی اور روایتی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ آخر کار معاشرہ کی اجتماعی قوت کی بدولت اس کو رسم یا رواج کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔''(۴)

یہ رسم و رواج ایک قابلِ یقین صورتِ حال کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت ایسے قوانین کی طرح ہے جن کی بدولت ملک اور گھر کا نظام چلایا جاتا ہے۔ ان رسومات کا سب سے زیادہ سرمایہ دیہی معاشرت میں ملتا ہے۔ یہ لوگ کافی حد تک اس سرمائے کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے زندگی بسر کر دیتے ہیں۔ پیدائش سے لے کر وفات تک ہر جگہ کچھ نہ کچھ رسومات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جب کسی گھر میں بچے کی پیدائش ہوتی ہے تو اس گھر کے باہر ''شرینہہ'' کے پتے لٹکا دینا ایک قدیم رسم کے طور پر رائج ہے۔ زچہ اور بچہ کے ساتھ ''چھری'' یا تیز دھار آلہ رکھ دینا تاکہ دونوں کو دیوی دیوتا اور جنات کے برے اثرات سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اس رسم کے ڈانڈے بھی زمانہ قدیم سے ملتے ہیں۔

عین الحق فرید کوٹی نے ''اردو زبان کی قدیم تاریخ'' میں ایسی رسومات کے بارے میں بتایا ہے کہ وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیبیں ''ہڑپا'' اور ''موہن جوداڑو'' کی تہذیبوں کے اثرات ابھی نمایاں نہیں ہوئے تھے، تب سے چلی آ رہی ہیں۔ یہ سینہ بہ سینہ سفر کرتے ہوئے ہمارے معاشرے تک پہنچی۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''منڈا قبائل برصغیر کے قدیم ترین باشندے ہیں اور دراوڑوں کی آمد سے قبل یہاں موجود تھے۔ برصغیر کا منڈا گروہ، کول، بھیل، سنتھال، منڈا، ساورا، ہو،

کوروا، جانگ اور کورکو وغیرہ قبائل پر مشتمل ہیں۔ فی زمانہ منڈا قبائل بھارت میں راجستھان سے لے کر بہار تک پھیلے ہوئے ہیں۔خاص کر وسط ہندان کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ قبائل تہذیب وتمدن کی دنیا سے دور گھنے جنگلات میں آباد ہیں۔''(۵)

دراوڑی تہذیب کے قبائل کا مطالعہ کیا جائے تو ایسی بہت سی رسومات ملتی ہیں جو ہزار ہا برس گزرنے کے باوجود آج بھی کسی نہ کسی صورت زندہ ہیں،جن میں ''دل دا'' جس کو''پانی وارنا'' کہا جاتا ہے۔ جب دولہا بارات کے ساتھ اپنے سسرال کے گھر جاتا ہے۔اس وقت ساس دولھے سے پانی وار کے پیتی ہے جس کو''پانی وارنا'' کہا جاتا ہے۔''داہر چی'' ساس دولھے کے ساتھ ساری بارات کو خوش آمدید کہتی ہے۔''دا آؤ'' شادی والے دن لڑکی کی سہیلیاں مختلف کنوؤں سے پانی بھر کر دلہن کو نہلاتی ہیں جس کو موجودہ عہد میں''گھڑولی'' کہا جاتا ہے۔''منڈا وادارم ٹکا'' جب بارات دلہن کے گھر پہنچتی ہے تو دلہن کی رشتہ دار لڑکیاں اور عورتیں راستہ روک لیتی ہیں جب تک ان کو لاگ رقم کی صورت میں نہ دیا جائے۔ وہ اندر داخل نہیں ہونے دیتیں۔ یہ رسومات دراوڑی تہذیب سے لے کر آج تک ہمارے معاشرے میں رائج ہیں۔

پنجابی زبان وادب اور معاشرے میں ایسی بہت سی رسومات موجود ہیں جو معاشرے کے ساتھ پیوست ہیں۔ یہ شادی بیاہ اور غمی پر اضافی اخراجات کا باعث ہوتی ہیں جب بھی کسی کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی ایک بہت بڑی ذمہ داری والدہ کے کندھوں پر آن پڑتی ہے۔پنجابی زبان میں مثل مشہور ہے کہ''دھریکاں تے کڑیاں جوان ہوندیاں دیر نہیں لگدی'' اسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بیٹی کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کے گھر بسانے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ بڑی عورتیں لڑکیوں کی دیکھ بھال اور ان کے جہیز کے لیے تنکا تنکا اکٹھا کر کے رکھتی ہیں۔معاشرے کی رسومات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر وہ چیز اپنی بیٹیوں کے لیے تیار کرتی ہیں جن کی ان کو ضرورت ہوتی ہے۔مقصود ناصر چودھری اپنے مضمون''ساڈیاں لوک رسماں'' میں لکھتے ہیں:

''دھیاں جیس ویلے جوان ہو جاندیاں نیں تے ماپیاں دی نیندر اڑ جاندی اے۔اوہ دنے راتیں ایس فکر وچ ڈبے رہندے نیں پئی چھیتی نال دھی دے ہتھ پیلے کر دِتے جاون تاں جے اوہ اپنے گھر بوہے والی ہو جاوے۔''(٦)

شادی کے موقع پر منگنی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔اس موقع پر زیورات، کپڑے اور دوسری چیزیں جن میں آج کل کو مختلف انواع واقسام کی مٹھائی اور فروٹ کو ٹوکریوں میں بند کر کے لڑکی والوں کے گھر بھیجی جاتی ہیں۔اگر تھوڑا سا پہلے کا ذکر کیا جائے تو اس کی جگہ دیسی گھی کی بنی ہوئی پنجیری اور اس میں مختلف انواع واقسام کے میوہ جات شامل کیے جاتے ہیں۔پنجیری ایک طاقت ور خوراک کے طور پر

مشہور ہے۔ یہ خوشی کے موقعوں اور زچگی کے وقت بڑی عمر کی عورتیں بناتی تھیں۔ یہ خاص مٹھائی اب بھی بعض علاقوں میں ہر دل عزیز خوراک ہے۔ بعض اوقات جاڑے کے موسم میں بھی بنائی جاتی تھی۔ یہ رسم اب بہت مشکل سے نظر آتی ہے۔ منگنی یا نکاح کے وقت چھوہارے اور گڑ تقسیم کیا جاتا تھا۔ اب اس کی جگہ ''پتاشے'' نے لے لی ہے۔ ایک اور رسم جو بعض دفعہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ نکاح اور منگنی کے وقت لڑکے اور لڑکی کے رشتہ داروں اور گھر والوں کے اوپر رنگ بھی پھینکنا، یہ رسم بہت سے علاقوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ زیادہ تر ہندو مذہب میں ''دیوالی'' کے تہوار میں رائج ہے۔ مگر اس کے برعکس مسلم ثقافت میں اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ موجودہ عہد سے تھوڑا سا ماضی کی طرف دیکھا جائے تو رشتے تلاش کرنا انتہائی جان جوکھن کا کام تھا۔ چھوٹی ذات والے لوگ یعنی ''مراثی'' اور ''نائی'' یہ کام کرتے تھے مگر جدید دور میں موبائل نے یہ کام انتہائی آسان بنا دیا اور بھی ایسی بہت سی رسومات جن میں مہندی، گانا، سہرا، ہار، وٹنا (چیکو)، گھڑولی، کھارا، بارات کی روانگی، ہر ایک رسم کے لیے ڈھول کی تھاپ الگ نوعیت کی حامل ہوتی اور ڈھول بجانے والے ڈھولی شادی والے گھر تقریباً آٹھ دن تک قیام کرتے۔ بہت سے غریب اور کمی لوگ شادی والے گھر اپنے اپنے حصے کا کام کرتے اور شادی کے آخر پر تمام افراد کو ان کی محنت کا صلہ دیا جاتا۔ ان رسموں کی ادائیگی کے لیے گیت الگ الگ نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مہندی، خوشی اور غمی دونوں جگہوں پر استعمال کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے بالوں کی سفیدی چھپائی جاتی ہے۔ اس کی مدد سے ہاتھوں اور پیروں پر انتہائی جاذبِ نظر بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔ مہندی کے خشک ہونے پر یہ واضح نظر آتے ہیں۔ دورِ جدید میں مہندی کو ''کون میں بھر کر لگایا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر دیکھا جائے تو اس کی جگہ ''ٹیٹو'' جو جسم کے مختلف حصوں پر مشین کی مدد سے بنائے جاتے ہیں۔ مہندی کا رنگ آہستہ آہستہ ماند پڑ جاتا ہے جب کہ ''ٹیٹو'' جلد میں پیوست ہوتا ہے اور کبھی ماند نہیں پڑتا۔ مہندی کے بارے میں ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد کا اقتباس:

> ''ویاہ توں کجھ دیہاڑے پہلے منڈے تے کڑی نوں اپنے اپنے گھر وچ مہندی لائی جاندی اے۔ ایس رسم وچ آل دوالے دے عزیز تے رشتہ دار شامل ہوندے نیں۔ مہندی منڈے نوں لائی جاوے یاں کڑی نوں ایہ سارا عمل عورتاں ولوں ہوندا اے۔''(٧)

مہندی کی رسم انتہائی قدیم تصور کی جاتی ہے جب کوئی جوان اور کنوارہ مرد جوان اور کنواری عورت فوت ہو جاتی ہے تو اس کو ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگائی جاتی ہے اس میں لواحقین کی طرف سے ایسی خوشیاں جوان کو جیتے جی میسر نہیں آئیں ان کی حسرت پوری کرنے کے لیے لگائی جاتی ہے۔ خوشی کے موقع پر مہندی لگانے کے بارے میں ڈاکٹر سید اختر حسین اختر لکھتے ہیں:

> ''شادی والے دن سے ایک دن پہلے رات کے وقت لڑکے اور لڑکی کو مہندی

لگائی جاتی ہے۔اس موقع پرلڑکی کے لیےمہندی لڑکے والوں کے ہاں سے جاتی ہے۔پوٹھوہاری لہجے میں اس رسم کو''بنڑایامہندی کی رسم'' کہتے ہیں۔''(۸)

مہندی کی رسم پر گائے جانے والے گیت مقبول اور زبان زدِ عام ہونے کے علاوہ ان میں ہمدردی کے جذبات کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ یہ رسم پورے برصغیر میں رائج ہے۔شعرا نے اس کو اپنی شاعری میں خاص زینت بخشی حتیٰ کہ صوفیائے کرام مہندی کی رسم کو اپنی شاعری میں شامل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''سرائیکی وسیب دسنجانڑں'' خواجہ غلام فرید کی شاعری کو دیکھا جائے تو اس میں بھی مہندی پر اشعار مل جاتے ہیں۔انھوں نے مہندی کے علاوہ عورت کی خوب صورتی میں اضافہ کرنے والی اشیا کا ذکر کیا ہے:

ہے ہے ڈھڑی کہیں نہ ویندی
کجل ساگ تے سرخی مہندی
سرمہ ، سیندھ ، سلائی وو یار(۹)

مہندی کی رسم شادی بیاہ کی اہم رسم ہے۔شادی سے ایک دن پہلے مہندی کی رسم کی جاتی ہے، ظہر کے بعد نائی یا نائن محلے کے گھروں اور رشتہ داروں کے گھر مہندی کا پیغام دینے جاتے ہیں اور وہ کسی بڑے تھال میں گھر کے ایک طرف مہندی لے کر بیٹھ جاتا ہے اور جو بھی مہمان مہندی کی رسم پہ آتا ہے اس کو مہندی دی جاتی ہے۔مہندی ہرے پتوں کو پیس کر بنائی جاتی ہے،اسے پانی میں گھول کے ہاتھ پر لگایا جاتا ہے جب وہ سوکھ جاتی ہے تو اسے دھو دیا جاتا ہے اور ہاتھوں پر اس کا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے:

نی لے دے مائیں کالیاں باگاں دی مہندی
گلی گلی میں پتر چنیندی آں لوکی کہندے مستانی
نی لے دے مائیں کالیاں باگاں دی مہندی
گھول مہندی میں ہتھاں تے لانی آں تے
وو ہٹڑی بن بن بہندی(۱۰)

دوسری طرف لڑکے کے ہاتھ پر بہنیں اور بھابیاں مہندی لگاتی ہیں اور ساتھ ہی یہ بات کہتی ہیں کہ تمھارا یہ کام تمھاری ماں نے سنوارا ہے:

اولیا بھولیا مہندی لاون
تیریاں بھیناں تے بھرجائیاں
اولیا بھولیا مہندی لاون وے
مہندی پاتر دمڑی
تیرا کم سنوارے امڑی(۱۱)

یہ رسمیں خوشی، غمی کے علاوہ مذہبی عقیدت میں بھی شمار کی جاتی ہیں۔ ''گانا'' بھی ایک قدیم رسم کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس کی جڑت مختلف روایات سے ملتی ہے۔ ایک تو ''گانا'' دولہے کو باندھا جاتا ہے اور ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں چھری بھی دی جاتی ہے تا کہ یہ نظرِ بد اور دیوی دیوتاؤں سے بچ جائے۔ اس کی حقیقت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ دولھے کے لیے گانا انتہائی محنت سے بنایا جاتا ہے۔ اس میں طرح طرح کے موتی ٹانکے جاتے ہیں جو دور سے ہی اپنی دل کشی کے باعث منفرد نظر آتا ہے۔ دولہے کو سہرا بھی باندھا جاتا ہے تا کہ اس کا منہ نظر نہ آئے۔ اس کو رستہ دیکھنے کے لیے ایک ہاتھ اپنے سہرے کے نیچے رکھنا پڑتا ہے۔ یہ سہرا جس کی بے شمار لڑیاں ہوتی ہیں موتیوں اور پھولوں سے مزین ہوتا ہے۔ برصغیر میں یہ رسم انتہائی قدیم تصور کی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا انتہائی مشکل کام ہے کہ اس کے کیا فوائد ہیں۔ اس رسم کے لیے بھی الگ سے گیت بنائے گئے ہیں۔ رہی بات ''گانے'' کی تو یہ مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اکثر اولیائے اللہ کے مزارات سے بھی مل جاتے ہیں جو مختلف قسم کے رنگوں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ ہندو ثقافت میں ''راکھی باندھنا'' بھی اس کی ایک مثال ہے۔ پنجاب میں ''گانا'' جب دولھے کو باندھا جاتا ہے تو اس کے گیت الگ نوعیت کے ہیں:

ماہی مٹھڑا گل نہ لاوم   گانے گہنے کھاون آوم
باس گلاں دی سیاہ مونجاوم   ساڈے باد نہاری وے(۱۲)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب کے معاشرے میں گانے کی کیا اہمیت ہے اور اس رسم کے پیچھے کتنی محبتیں، کتنی نیک خواہشات، امیدوں اور دعاؤں کے انبار ہیں جن کا اظہار گانے کے گیتوں میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے:

تیرے گانے توں میں واری
گانے والیاں
مان جوانیاں(۱۳)

''گانا'' دولھے اور دولہن دونوں کو باندھا جاتا ہے۔ ''گانا'' باندھ کر دولھے کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ اب تیرے کندھے پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہو گئی ہے۔ اب وہ آزاد نہیں رہا اس کو اپنی گھریلو ذمہ داریاں احسن طریقے سے انجام دینی ہوں گی۔ ماں باپ اور بہن بھائی کے علاوہ اس کو اپنی بیوی کے حقوق کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ پنجاب میں ایسی بہت سی رسومات رائج ہیں جن پر پابندی لازمی تصور کی جاتی ہے۔ پیدائش سے لے کر مرتے دم تک یہ رسوم و روایات انسان کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ جب کوئی آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اوپر ''لنگی'' خوشاب شہر کی بنی ہوئی چادر ڈالی جاتی ہے۔ یہ چادر انتہائی اعلیٰ قسم کی بھی ہوتی ہے اور کم معیار کی بھی۔ یہ چادر قبر بنانے والے اتار لیتے ہیں۔ جب کسی گھر میں کوئی فوت ہو جاتا ہے تو اس گھر میں تعزیت کے لیے آنے والی خواتین بین کر کر کے روتی

ہیں اور ان کی بھی اپنی ایک مخصوص لے ہوتی ہے۔ کسی نے کیا خوب بات کہی تھی کہ ''جمنڑ اں وی پنجاب داتے مرناوی پنجاب دا'' اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے آنے والے مہمان کی تواضع کس شان سے ہوتی ہے اور جانے والے کا اختتام کس انداز میں کیا جاتا ہے۔ ان رسومات اور انسان کا تعلق چولی دامن جیسا ہے جو ایک اٹل حقیقت ہے۔ چاہے وہ ایک تہذیب یافتہ معاشرے کا باسی ہو چاہے اس کا تعلق افریقہ کے ان وحشی قبائل ہی سے کیوں نہ ہو؟

حوالہ جات

١۔ ایس۔این۔اے داس گپتا، تاریخ ہندی فلسفہ، ترجمہ: اے شِوموہن لعل ماتھر، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ٢٠٠٣ء، ص: ٣٥

٢۔ وارث سرہندی، قاموس مترادفات، لاہور: اردو سائنس بورڈ، طبع سوم، ٢٠٠٦ء، ص: ٦٥٤

٣۔ عبدالمجید، خواجہ، جامع اللغات، جلد دوم، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ٢٠١٠ء، ص: ١١٢٣

٤۔ رزاقی، شاہد حسین، پاکستانی مسلمانوں کے رسم ورواج، لاہور: دین محمد پریس، ١٩٦٥ء، ص: ٢٥٩

٥۔ مقصود ناصر، چودھری، ساڈیاں لوک رسماں، مشمولہ: سانجھ وچار، مرتبہ: سعید بھٹا، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ١٩٩٧ء، ص: ٥٨۔٥٧

٦۔ ایضاً، ص: ٥٩

٧۔ زاہد، عصمت اللہ، ڈاکٹر، ادب سمندر، لاہور: اے ون پبلشرز، ١٩٨٩ء، ص: ٥٠٣

٨۔ اختر، اختر حسین، سید، ڈاکٹر، پنجاب کی لوک ریت، لاہور: لہراں ادبی بورڈ، ٢٠٠١ء، ص: ٢٧

٩۔ محمد آصف خان، آکھیا خواجہ فرید نے، لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ١٩٩٤ء، ص: ١١٣

١٠۔ پنجابی لوک گیت، لاہور: نیشنل کونسل آف میوزک، ١٩٦٥ء، ص: ٤٣

١١۔ محمد اکرم سعید، چرخے دی گھوک، لاہور: انسٹی ٹیوٹ آف پنجابی لینگوئج اینڈ کلچر، ١٩٩٧ء، ص: ٥٤

١٢۔ محمد آصف خان، آکھیا خواجہ فرید نے، ص: ٢٩٧

١٣۔ زاہد، عصمت اللہ، ڈاکٹر، ادب سمندر، ص: ٥٠٥

☆......☆......☆